بانو قدسیہ۔حیات اور صوفیانہ افکار

Bāno Qudsia: Life and Spiritual Thoughts

Dr. Aqlima Naz
Assistant Professor, Department of Urdu
Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi
Email: aqlimanaz@fjwu.edu.pk

ABSTRACT

Bāno Qudsia is a versatile genius of Urdu Literature. She is considered a remarkable literary figure round the globe. There are multiple layers of her intellectual endeavor. Her multifaceted novelty and ingenuity is reflected in different genres including short story, novel, drama and autobiography. Her literary enterprise has heightened her artistic stature among Urdu writers. Thirty one (31) books have been published by Bāno Qudsia. Love and spiritual inspiration has always been apparent in all her writings and scripts. She has a close association with Spirituality. This article presents life and spiritual thoughts in context of her Novel "Rājah Gidh".

Keywords: *Spirituality, Bāno Qudsia, Urdu Novel, Rājah Gidh.*

تصوف اور اردو ادب کا رشتہ بہت گہرا اور قدیمی ہے۔ ابتداء ہی سے مختلف ادوار میں شعراء اور ادباء اپنے اپنے انداز میں داخلی کیفیات اور واردات کے اظہار کے لیے اردو ادب کا سہارا لیتے آئے ہیں۔ دورِ حاضر کی معروف لکھاری بانو قدسیہ نے بھی صوفیانہ افکار و خیالات کے اظہار کے لیے اُردو ادب کو وسیلہ بنایا۔

اردو ادب میں بانو قدسیہ کا نام یقیناً کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ دور حاضر کی ایک ایسی منفرد تخلیق کار ہیں جنہوں نے افسانہ، ناول، ڈرامہ اور شخصیت نگاری میں اپنی انفرادیت سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ بانو قدسیہ تصوف کے موضوع سے طبعی مناسبت رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ زندگی کی خارجی سطح پر رونما ہونے والے حالات و واقعات کو باطنی شعور کی مدد سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانہ جہاں سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں، وہیں حیات و کائنات کے حقیقی مسائل اور موضوعات کو بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں تصوف کی روحانی اور باطنی کیفیات کا ذکر پوری آب و تاب سے ملتا ہے۔ حیات و کائنات اور انسانی وجود کی اصل حقیقیت سے متعلق بیشمار سوال اٹھاتی ہیں کہ اس کائنات میں انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اسے کائنات میں بھیجنے کا مقصد کیا ہے؟ اور پھر ان سوالات کے جوابات مذہب اور عقائد کی روشنی میں تلاش کرتی ہیں۔ بعض افسانوں کے

واقعات پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ماورائی ہستی موجود ہے جو تمام امور کائنات کو اپنی منشاء کے مطابق چلا رہی ہے۔اپنے افسانوں میں مختلف مذہبی قصوں اور کہانیوں کے ذریعے سے اپنے مقصد کی تبلیغ کرتی ہیں،ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانیت کی منزل کو پالینے کے لئے انتہائی صبر و تحمل اور مسلسل ریاضت کی ضرورت ہے۔

اس حوالہ سے ان کے اہم افسانوں میں ''خود شناس''،''جھکورا''،''نیلوفر''،''مراجعت'' اور ''راجہ گدھ'' وغیرہ شامل ہیں۔

بانو قدسیہ اُردو فکشن کی ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں جن کے ادبی کارنامے ایک طویل عرصے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جو کہ ان کے گہرے مشاہدے اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں۔وہ اُردو کی عہد ساز افسانہ نگار،رجحان ساز ناول نگار،ممتاز ڈرامہ نگار،اعلیٰ پائے کی شخصیت نگار اور مشہور و معروف دانشور ہیں۔ان کے افسانے،ناول،ڈرامے،شخصیت نگاری اور ادبی صحافت ہمارے عصری ادبی سرمائے کا انتہائی اہم حصّہ ہیں۔

آزادی کے بعد پاکستان میں نئے ابھرنے والے لکھاریوں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔اس مقالہ کے دو اجزاء ہیں۔

۱۔بانو قدسیہ کی حیات اور ۲۔صوفیانہ افکار (''راجہ گدھ'' کے تناظر میں)

بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۷ء) مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔والدہ نے ان کا نام قدسیہ بانو رکھا مگر بعد میں ممتاز افسانہ نگار اور بانو قدسیہ کے شوہر اشفاق احمد نے ان کا نام بانو قدسیہ تبدیل کر دیا تا کہ نام میں ادبیت ظاہر ہو۔بانو قدسیہ ابھی ساڑھے تین سال کی تھیں کہ ان کے والد بدرالزمان کی عمر نے وفا نہ کی اور جوانی میں ہی دو بچوں اور ایک بیوی کو چھوڑ کر ۱۹۳۲ء میں انتقال کر گئے۔بانو قدسیہ کی والدہ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں۔شوہر کی وفات کے بعد یہ خاندان دھر مسالہ میں منتقل ہو گیا۔

دھر مسالہ میں میٹرک کے بعد بانو قدسیہ کا تعلیم جاری رکھنے کا سلسلہ تشویش ناک صورتِ حال کا شکار ہو گیا۔کیونکہ وہاں لڑکیوں کے لیے علیٰحدہ کالج نہیں تھا وہاں مخلوط تعلیم کی بناء پر بانو قدسیہ کے بھائی ان کی مزید تعلیم کے حق میں نہ تھے جبکہ لڑکیوں کا کالج صرف لاہور میں تھا۔ایسے میں بانو قدسیہ کی صاحبِ بصیرت والدہ نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا۔انھوں نے کچھ تعلیم یافتہ روشن خیالات کے مالک والدین کی معاونت سے دھر مسالہ میں ہی لڑکیوں کا ایک کالج کھول لیا جس میں دوسری بہت سی لڑکیوں کے ساتھ بانو قدسیہ بھی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ایف۔اے کرنے کے بعد انھوں نے کنیئرڈ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔لاہور اس زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ تھا۔برصغیر کے طول و عرض سے تشنگانِ علم یہاں کشاں کشاں آتے اور علوم و فنون سے فیض یاب ہوتے۔اس دوران ان کا خاندان گورداسپور میں منتقل ہو چکا تھا اور ان کی والدہ ڈسٹرکٹ انسپکٹریس آف سکولز بن چکی تھیں۔بانو قدسیہ بی۔اے کا امتحان دینے کے بعد اپنی والدہ کے پاس آ گئیں جو ایک سکھ کی حویلی میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی تھیں۔۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے وقت بانو قدسیہ اور ان کا خاندان پاکستان ہجرت کر آئے اور لاہور قیام کیا۔بانو قدسیہ کا بی۔اے کا نتیجہ لاہور آنے کے بعد نکلا اور وہ کامیاب ٹھہریں۔اب ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد بانو کی شادی کر دی جائے کیونکہ وہ بانو قدسیہ کی مزید تعلیم کے بارے میں ایک بار پھر انہی خدشات کا شکار تھیں

جن کا سامنا انھیں بانو قدسیہ کے میٹرک کے امتحانات کے بعد ہوا تھا۔ کنیئرڈ کالج میں تعلیم صرف بی۔اے تک تھی۔ایم۔اے گورنمنٹ کالج سے ہی کیا جا سکتا تھا اور وہاں مخلوط تعلیم تھی۔اسی کشمکش میں بانو قدسیہ کا ڈیڑھ سال تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ چنانچہ والدہ کی دوست آپا زبیدہ کے کہنے پر بانو قدسیہ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اردو میں داخلہ دلا دیا گیا۔

بانو قدسیہ کا گھرانہ تہذیب و شائستگی کا گہوارہ تھا۔ان لوگوں کا پس منظر تکلف و تصنع سے پاک دیہاتی اور سادہ تھا۔ بانو قدسیہ کی والدہ حد درجہ نیک سیرت اور راسخ العقیدہ خاتون تھیں۔انھوں نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس کے عہدے پر فائز تھیں۔ تنخواہ کا بیشتر حصّہ غریبوں کو خیرات دینے میں خرچ کر دیتی تھیں۔وہ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ تھیں۔ان کا گھرانہ اسلام کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔مذہب سے ان کے والہانہ لگاؤ کے متعلق ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

> قدسی کی امی پر تو ہر وقت اسلامی دیوانگی مسلط رہتی ہے۔اس حد تک کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ نمازیں، وظیفے۔ مسئلے ایک اسلامی جنون ہے جو مد ہی مد جانتا ہے جزر سے آشنا نہیں۔[1]

بانو قدسیہ کی شخصیت پر اپنی والدہ کے کردار کی جھلکیاں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ان میں متانت، سنجیدگی، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور اصول پسندی جیسے اوصاف شامل تھے۔ بانو قدسیہ کی ذات میں والدہ کی یہ تمام صفات بچپن سے ہی ودیعت ہو گئی تھیں۔ بانو قدسیہ یوں تو کئی معلوماتی کتب مشغلے کے طور پر پڑھتی رہیں لیکن قرآن پاک کی طرف سے ہمیشہ لاپرواہی برتتی رہیں۔اگرچہ گھر میں والدہ سے کبھی کبھار پڑھتی رہیں تاہم باقاعدہ طور پر قران پاک کی تعلیم ۱۳ سال کی عمر میں حاصل کی۔وہ خود کہتی تھیں۔

> کوئٹہ میں میری خالہ ڈاکٹر تھیں۔وہ بہت دیندار تھیں۔میری عمر اس وقت تیرہ سال تھی جب میں ایک دفعہ ان کے پاس چھٹیاں گزارنے گئی۔ان دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر صادق عربی کے پروفیسر تھے۔میری خالہ نے ان سے کہا کہ بانو قدسیہ کو قرآن پاک پڑھنا سکھائیں۔ چنانچہ ان سے ملاقات ہوئی تو میری قرآن پاک میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور میں نے قرآن پاک پڑھ لیا۔[2]

اشفاق احمد معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور دانش ور ان کے کلاس فیلو تھے اور بعد میں ان کے شوہر بنے۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی ادبی ملاقاتوں کا نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا۔یہ ادبی ملاقاتیں ذہنی ہم آہنگی کا باعث بنیں جو قلبی تعلق کا روپ دھارتے ہوئے دائمی رفاقت تک پہنچ گئیں۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت بنے رہے۔دونوں ایک مکان کی ایسی اینٹیں ہیں جو باہم مل کر ایک دوسرے کو تھامے رکھتی ہیں۔اب کس اینٹ نے کس اینٹ کو سہارا دے رکھا ہے اس پر میں کیا کہوں؟ البتہ یہ اور بات ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔اشفاق صاحب بقول بانو قدسیہ ان کے مرشد ہیں، باباجی ہیں جو بچوں کو پچکارتے ہیں اور ناراض ہو کر جھاڑ بھی پلا دیتے ہیں، اشفاق احمد کے فیض سے تو بہت سے اپنی ہستی کا کونڈا بھرتے ہوں گے پر بانو قدسیہ کا فیض خاص اشفاق احمد کے لیے ہے۔یوں وہ اشفاق احمد پر سبقت لے جاتی ہیں۔[3]

یوں تو پانچویں جماعت سے ہی بانو قدسیہ نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیا تھا مگر باقاعدہ طور پر بانو قدسیہ نے ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد لکھنے کی ابتداء کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی آزادانہ فضانے ان کے ادبی ذوق کی تسکین میں اہم کردار ادا کیا۔ مخلوط تعلیم نے انھیں اعتماد کی ایسی دولت عطا کی جس کے اثرات ان کی تحریروں میں واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔اشفاق احمد نے ان سے افسانہ لیا اور ''واماندگیِ شوق'' کے عنوان سے ممتاز ادبی ماہنامے '' ادبِ لطیف'' میں چھپوا دیا جو کہ ان کے مجموعہ '' آتش زیرِ پا'' میں موجود ہے۔اس افسانے میں انسانی زندگی میں دُکھ اور سکھ کی آمیزش کو بیان کیا گیا ہے۔

بانو قدسیہ نے افسانہ نگاری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ان کے افسانوں کی نو کتابیں ''کچھ اور نہیں''، ''بازگشت''، ''دوسرا دروازہ''، ''آتش زیرِ پا''، ''امر بیل''، ''سامانِ وجود''، ''ناقابل ذکر''، ''دست بستہ''، ''ہجرتوں کے درمیان''ہیں۔انھوں نے تین ناول ''راجہ گدھ''، ''حاصل گھاٹ''، ''شہرِ لازوال، آباد ویرانے''، اور چار ناولٹ ''شہرِ بے مثال''، ''ایک دن''، ''پروا''، ''موم کی گلیاں'' لکھے ہیں۔ جبکہ ڈراموں کی تیرہ کتب ہیں۔اس کے علاوہ شخصیت نگاری سے متعلقہ بھی دو کتب ہیں۔

بانو قدسیہ سیدھی سادھی مذہبی روایات کی پابند اور مغربی اقدار سے دور ایک گھریلو خاتون تھیں۔ جدید تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود سادہ طرزِ زندگی کی قائل تھیں مگر ادبی میدان میں بڑی دقیق النظر تھیں اور اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں زندگی کے ہر پہلو کا اس باریک بینی سے مشاہدہ کرتی تھیں کہ جزئیات نگاری میں ایک خاص مقام کی حامل قرار پائیں۔

بانو قدسیہ خوبصورت دل کی ہی نہیں بلکہ خوبصورت شخصیت کی مالک بھی تھیں۔ انتہائی شیریں زبان اور خوش گفتار تھیں۔انسان دوست اور ہمدرد تھیں۔ ملنسار و غمگسار تھیں۔ گفتگو میں سچائی اور لہجے میں گہرائی تھی۔ان کا ظاہر و باطن چشمے کی مانند صاف وشفاف، سب کی خدمت گزار، سب کو سیراب کرنے کی آرزومند ہر دلعزیز شخصیت کی حامل تھیں۔ تقریباً پچاسی سال سے زائد عمر گزارنے کے باوجود ان کا صاف دہکتا ہوا رنگ ان کی خوبصورتی کی دلالت پیش کرتا تھا۔ بانو قدسیہ بیضوی چہرہ، متناسب قد، کشادہ پیشانی، متحیّر آنکھیں، چہرے پر اطمینان اور سکون کا احساس لیے، سلیقے سے اوڑھے ہوئے دوپٹے میں فرشتہ صورت دکھائی دیتی تھیں۔ان کی پیشانی پر پھیلی ہوئی گہری شکنیں اپنے اندر کئی کہانیوں اور تفکرات کو سمیٹے ہوئے تھیں۔ سر پر سفید بالوں نے ان کے گرد نور کا ہالہ سا کھینچ دیا تھا۔عبدالوحید اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> میں تو بانو قدسیہ کو سفید دوپٹہ اوڑھے، معصوم اور پاکیزہ مریم کی طرح روحانیت کا پرچار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ جو معاشرے کو ایک دم اُجلا اور صاف ستھرا بنا دینا چاہتی ہیں یا پھر ایک ماں کی طرح، جو اپنی بانہیں پھیلا کر معاشرے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔[4]

ان کی شخصیت کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک ایسی حسین و جمیل خاتون کی تصویر ہے جو کہ خود پسند تھیں۔ باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مشرقی روایات واقدار کی حامی تھیں۔ یہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کو موہ لیتی ہے۔ جو ان کے پاس گیا کچھ بن کر آیا۔ان سے ملنے کے بعد طبیعت کھل اُٹھتی تھیں۔

وہ مشرقی مزاج کی ایسی خاتون ہیں، جو روشن خیال اور جدیدیت پسند ہونے کے باوجود دوپٹے کو سر سے سرکنے نہیں دیتیں۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح اطمینان و شانتی ان کے چہرے پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مہاتما بدھ کا مجسمہ بول نہیں سکتا، لیکن بانو قدسیہ جب بولتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ انھوں نے دنیا سے خیر اور نیکی کے جو تجربے حاصل کیے ہیں اب انھیں بڑی دریادلی سے تقسیم کر رہی ہیں۔[5]

کسی بڑی شخصیت کی نشوونما اور پرداخت میں جس قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماحول گھر اور تعلیمی درسگاہ دونوں میں بانو قدسیہ کو میسر آیا۔ بانو قدسیہ نے تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مسز ذاکرہ چٹھہ کی صورت میں ان کے لیے ماں کی گود پہلا علمی و ادبی گہوارہ تھی جس نے بانو قدسیہ کی ذہانت اور قابلیت کو جلا بخشی۔ مسز ذاکرہ چٹھہ نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہوا تھا۔ وہ بہت ذہین، قابل اور اعلیٰ ذوق کی حامل خوبصورت خاتون تھیں۔ شائستگی اور سادگی ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ بانو قدسیہ کی شخصیت کی فطری سادگی اور تہذیب انہی کی تربیت کی مرہونِ منت ہے۔ بانو قدسیہ اگرچہ چھوٹی عمر میں ہی باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی تھیں لیکن یتیمی کا احساس قطعاً نہ ہوا کیونکہ ماں کا سایہ ان کے سر پر تھا اور مسز ذاکرہ چٹھہ نے ان کو باپ کی سی محبت اور شفقت دی۔ ان کا بچپن ناز و نعم سے گزرا اور گھر میں نسبتاً خوشحالی تھی۔ گھر کی چار دیواری میں انھیں علم و فن کا گہوارہ اور شائستگی کا سبق تو ملا ہی تھا، گھر سے باہر کے تعلیمی ماحول میں بھی تہذیب و شائستگی کے تقاضوں کو بنیادی اقدار کی جگہ حاصل تھی۔ کنیئرڈ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور کی آزاد فضا میں انھیں تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ یہاں کی تعلیم اور علمی ماحول نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسی ماحول میں ان کی تخلیقی و فکری پرورش ہوئی اور فکر و نظر کی کایا پلٹ گئی۔ بانو قدسیہ ذہین تو تھیں ہی جب اشفاق احمد جیسے قابل اور علم دوست کی رفاقت نصیب ہوئی تو ان کی رہنمائی نے ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے اور ان کی علمی و ادبی شخصیت کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے انھیں علمی و ادبی حلقوں میں متعارف کرانے میں مدد دی، شادی کے بعد وہ ایک ایسے گھر کا حصّہ رہیں جہاں دن رات تحریر و تقریر کے پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ محفلیں سجائی جاتیں، پروگرام ترتیب دیے جاتے، علم و ادب، تنقید، نفسیات اور روحانیت پر کھل کر بات ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان پہلوؤں سے متعلق نمونے اکثر ان کی تخلیقات میں ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ صابر لودھی لکھتے ہیں۔

علم دوستی اور کتب بینی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ دوسری طرف اشفاق احمد کے حلقۂ احباب میں ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے ذکی اور فہیم لوگ شامل تھے جو ایک خاندان کی طرح مل کر رہتے تھے۔ افسانے لکھتے اور افسانے کہتے تھے۔ بانو آپا کو ایک علمی اور افسانوی ماحول گھر میں میسر آیا اور پھر بانو آپا کے دل میں چھپی ہوئی تخلیق کی کونپل نے سر اٹھایا۔ فن کا اکھوا پھوٹا اور تخلیق کی پھوار پڑنے لگی۔[6]

بانو قدسیہ کا اخلاق حد درجہ بلند تھا۔ اس قدر بڑی ادیبہ ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے انتہائی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھیں ۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا تھا، خوش ہو کر آتا تھا اور عمر بھر ان کے حسنِ اخلاق کا مدّاح رہتا ہے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے

شفقت تو کرتی ہی تھیں لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتی تھیں۔ نوکروں سے بھی شفقت اور ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور اہلِ خانہ تو اس کے لیے سب سے زیادہ مستحق ہوئے ہیں۔ اپنے بچوں کی بات کو ہمیشہ غور سے سنتیں اور اس کو اہمیت بھی دیتی تھیں۔ اپنے شوہر اشفاق احمد کے ساتھ قریباً پچاس سال کا طویل دورانیہ گزارا مگر کبھی کسی بات پر لڑائی تو کجا، بحث کی نوبت بھی نہیں آئی۔

بچپن میں، اپنا ایک ہی میرا بھائی تھا، میں اس سے کبھی لڑی نہیں، پھر اشفاق صاحب کے ساتھ رہی، غالباً آج وہ یہاں موجود ہوتے تو آپ کو وہ گواہی دیتے کہ میں ان سے لڑی نہیں۔[7]

عزیزوں کے علاوہ اجنبی اور غیر بھی ہمیشہ ان کی مروّت اور دردمندی سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کبھی ذات پات اور مرتبے کی تفریق نہیں کی۔ منافقت اور ریاکاری ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ نیکی اور خیر خواہی ان کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی۔ ان میں انتہائی درجے کی خاکساری، خوش مزاجی اور راست گوئی تھی۔ ان کے محاسنِ اخلاق میں لوگوں کے لیے بڑی کشش تھی۔

بانو قدسیہ کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ اپنے اندر اایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ وہ تفکر و تحیّر کی اس سطح پر تھیں جہاں انسان صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار نظر آتا ہے۔ ان جیسی مقناطیسی شخصیت اردو زبان و ادب میں اب تک دستِ قدرت نے تخلیق نہیں کی۔ ان کی ایک ایسی دیدہ ور شخصیت تھی جو نرگس کی ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔

بانو قدسیہ اپنے ادبی کام سے کبھی مطمئن نظر نہیں آئیں اور نہ ہی کسی احساسِ تفاخر اور خود ستائی کی مرتکب ہوئیں بلکہ انکساری اور فروتنی ان کی شخصیت کا حصّہ رہی۔ یہی عجز و انکساری انھیں اظہار کی نئی نئی راہوں پر چلنے کو اکساتی رہی اور وہ پُر پیچ راہوں پر بھی کامراں اور سرخرو ٹھہریں۔

اتنی شہرت و عزت کے باوجود انکساری ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی درویشی اور استغنا کی ایک جھلک اس وقت دیکھنے میں آئی جب انھوں نے پی ٹی وی ایوارڈ سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ بعد میں دوماپرائز کے موقع پر کی جانے والی تقریر کے دوران کہا۔

بہت سال پہلے جب میں پی ٹی وی ایوارڈ سے دستبردار ہوئی تو میری انا کو بہت سہارا ملا۔۔۔ تب میرا خیال تھا کہ اگر باپ تلوار نہ رکھے تو بیٹے کے ہاتھ سیف آشنا نہیں ہوتے اور آگے چل کر رستم و سہراب کی کہانی ضرور پیش آتی ہے۔ اگر ماں کے سامنے سے آئینہ نہ ہٹے تو بیٹی کے لیے ڈپریشن کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ جب بوڑھے مشاہیر ہر سال انعاموں کے لوٹ سیل سے عطیات اڑانے لگیں تو اس قوم کے نئے مشاہیر قد آور نہیں رہتے۔[8]

ان کی زندگی کا ایک اور پہلوان کے مزاج میں خیر اندیشی کا عنصر ہے۔ زندگی کے بارے میں ہمیشہ مثبت اندازِ فکر اپنایا۔ زندگی کو کبھی تاریک زاویے سے نہیں بلکہ روشن زاویے سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ کبھی مایوسی اور ناامیدی کی بات نہیں کی۔ زندگی کو بے جا پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کا گورکھ دھندا نہیں بناتیں اور نہ ہی دوسروں کو الجھا کر خوش ہوتی تھیں۔ ہر جگہ حسن، خیر اور خوبی کی متلاشی رہیں۔

ہر معاملے کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کرنے اور ہر اُلجھن کو سلجھانے کے فن سے واقف تھیں۔ عبدالوحید کا کہنا ہے۔

اس وقت وہ واحد خاتون ہیں جو صرف صداقت لکھنے اور کہنے میں کسی مصلحت کو دیوار نہیں بننے دیتیں۔ وہ معاشرے کی رگوں میں اترتے ہوئے زہر کو اس طرح کھینچ کر باہر لے آتی ہیں کہ ان پر کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کا گمان ہوتا ہے۔[9]

بانو قدسیہ انتہائی بابرکت ہستی تھیں۔ ان کی شخصیت نیکی، شرافت اور نفاست کا مجموعہ تھا۔ تمام عمر انھیں اللہ رب العزّت پر کامل توکل رہا اور ہر مشکل گھڑی انہوں نے پروردگار سے رجوع کیا۔

بانو قدسیہ نے تین عمرے کیے اور تینوں بار اشفاق احمد ان کے ہمراہ تھے۔ تیسری بار عمرے کے دوران بانو قدسیہ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بانو قدسیہ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی اشفاق احمد کا انتظار کر رہی تھیں کہ ایک نوجوان آیا اور پیپر گلاس میں زمزم کا پانی بڑی محبت اور احترام سے بانو قدسیہ کو پیش کیا اور یکدم غائب ہو گیا۔ اشفاق احمد کی واپسی پر بانو قدسیہ نے انھیں یہ واقعہ سنایا تو اشفاق احمد نے اسے خوشگوار واقعہ قرار دیا اور شکر ادا کرنے کی ترغیب دی۔ بانو قدسیہ اس واقعے کے متعلق ''راہِ رواں''میں لکھتی ہیں۔

مجھے آج تک اللہ کی اس رحمت کی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی لگتا ہے اس گلاس کی وجہ سے میرے سارے دنیاوی کام سہل ہوئے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ یہ گلاس اس بات کا مظہر ہے کہ میرا عمرہ قبول ہو گیا۔ کبھی خوش فہمی ہوتی کہ میرے گناہ معاف کر کے مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح رحمت کا بپتسمہ دیا گیا۔[10]

بانو قدسیہ مشیتِ ایزدی کے اس فیصلے پر رضامند رہیں اور اسے اپنے رب کی خاص عنایت قرار دیا۔ انہوں نے کہا:

انسان کے ہر اچھے سے اچھے عمل کا راستہ برے عمل کی طرف نکل سکتا ہے اور اس کی بدی کا دروازہ ایک توبہ سے نیکی کی راہ پر کھل سکتا ہے۔ میری اس دلآزاری سے میرے لیے ایک بہت ہی اچھا تجربہ میری زندگی میں شامل ہوا۔ میں نے قلم اور کاغذ تھام لیا اور اپنی دلچسپی کی سمت بدل ڈالی۔[11]

بانو قدسیہ کو اشفاق احمد کے توسط سے بابوں کے ڈیروں پر جانے کا بھی موقع میسر آیا جہاں چٹائیاں بچھی ہوتیں، لوگ عبادات میں مشغول ہوتے، لنگر چل رہے ہوتے، روحانیت پر کھل کر بحثیں اور مکالمات جاری ہوتے، جہاں اللہ کی وحدت کثرت کا روپ دھار لیتی، دنیادار، سیانے، عاشق، دیوانے، فقیر، مستانے، ہنسوڑ، رقت سے لبریز، چور اور چوری سے بیزار چور، خیرات میں سب کچھ بانٹ ڈالنے والے، راست باز، دروغ گو غرض اللہ کا رنگ کئی ان گنت رنگوں میں بٹا ہوتا۔ اشفاق احمد نور والے باباجی کے مرید تھے۔ وہ بانو قدسیہ کو بھی ان کے ڈیرے پر لے کر جانے لگے۔ باباجی کی تربیت نے بانو قدسیہ جیسی دورنگی دنیا کی باسی شخصیت کو بھی اپنے حصار میں لے لیا یوں بانو قدسیہ باقاعدگی سے ڈیرہ پاک جانے لگیں۔ وہ کہتی تھیں۔ باباجی کے ڈیرے پر جانا، وہیں لنگر کرنا، مزے اڑانا، خالی الذہن ہونا، فکر فاقے سے اپنے آپ کو آزاد کرنا میرا انجوائے کرنے کا نیا طریق تھا۔ نہ کبھی ان کے درجات کے متعلق سوچا نہ کبھی اس طرف دھیان گیا کہ ان کے کشف و کرامات سے کچھ مجھ میں تبدیلی آ رہی ہے۔[12]

ان کی شخصیت کا یہ رنگ ان کی تصانیف میں بھی جھلکتا ہے۔ اگرچہ ان کا اپنا خیال ہے کہ انھیں کوئی روحانی تجربہ زندگی میں نہیں ہوا جیسا کہ ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے کہا۔

میں عارفِ دنیا ہوں، دنیادار ہوں، یہ میرا کام نہیں ہے خدا کو تلاش کرنا، مجھے اگر اچانک کہیں مل جائے تو شاید میں پہچان بھی نہ سکوں، مجھے ایسا کوئی روحانی تجربہ نہیں ہوا کہ میں آپ سے کہوں کہ مجھے یہ تجربہ ہوا، یہ میں نے دیکھا، ان بابوں کی باتیں سنتی رہتی تھی تو دل میں کبھی ہنستی تھی، کبھی مان لیتی تھی، کبھی نہیں مانتی تھی۔[13]

لیکن لاشعوری طور پر یہ اثرات ان کی تصانیف پر مرتب ہوتے رہے۔ ان کی تصنیف ''راجہ گدھ'' ان کے روحانیت کے تجربے کو اظہار کی گرفت میں لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے جس میں انھوں نے انسانی زندگی کے ایسے پوشیدہ پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے جن کا ادراک ایک عام انسان کی فہم سے بالاتر ہے۔ '' راجہ گدھ'' کا موضوع حرام و حلال کے اسلامی تصور کو واضح کرتا ہے۔ رزقِ حرام کے منفی اثرات کو اجاگر کر کے بانو قدسیہ اسے دیوانے پن، اخلاقی زوال اور قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کا سبب قرار دیتی ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رزقِ حرام کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دونوں ہی زوال اور پستی کا شکار ہو رہے ہیں۔

''راجہ گدھ'' لکھ کر بانو قدسیہ نے بڑے بڑے لکھنے والوں کو مات دے دی۔ جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ ناول انھوں نے خود نہیں لکھا بلکہ ان سے لکھوایا گیا ہے۔ ہوا یوں کہ ان کے گھر کچھ عرصہ سے ایک امریکی نوجوان ''باب ہیز'' کسی کام کے سلسلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے اپنے مذہب سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ ہر بات برداشت کر لیتا تھا لیکن اپنے مذہب کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز گفتگو کے دوران بانو قدسیہ نے مغربی معاشرتی نقائص کے متعلق کچھ ایسی باتیں کیں کہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئیں اور اس نے بانو قدسیہ سے اسلام کے Essence (جوہر) کے متعلق دریافت کیا۔ بانو قدسیہ نے بتایا کہ اسلام کا ایسنز اخوت، توحید اور برابری ہے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ تعلیمات تو ہر مذہب کی بنیاد ہیں، اسلام میں اور ان میں تو پھر کوئی فرق نہ ہوا۔ یہ کہہ کر اس نے بانو قدسیہ کو سوچ کی ایک نئی راہ پر لا کھڑا کیا۔ چنانچہ وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ ان کی اپنے صحن میں موجود سندری کے درخت پر نظر پڑی۔ سندری کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے جس سے سارنگی کا ساز بنایا جاتا ہے اور رات کے وقت اس کے تنوں میں درد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ سارا درخت یکدم سفید ہو گیا اور ایسا لگا جیسے اس پر لکھا ہوا ہو کہ اسلام کا ایسنز رزقِ حرام و حلال ہے اور یہ ایسا ایسنز تھا جو کسی اور مذہب میں موجود نہ تھا۔ بانو قدسیہ نے جب باب ہیز کو اسلام کے ایسنز کے متعلق بتایا تو وہ بھی خاموش ہو گیا گویا اس نے بھی اس فرق کو تسلیم کر لیا ہو۔ یوں اس واقعے نے بانو قدسیہ کی دنیا کو بدل دیا جو بالآخر ''راجہ گدھ'' کی صورت میں منقلب ہو کر سامنے آیا۔[14]

وہ لکھتی ہیں۔ باب ہیز کی یہ بحث مجھ میں ایک بیج بو گئی۔ وہ پاکستان سے چلا گیا اور کچھ برسوں بعد اس دن کے گیان نے ''راجہ گدھ'' کی صورت اختیار کر لی۔ یقین جانیے ''راجہ گدھ'' جسے خان صاحب نے نہیں پڑھا اور جسے میں نے نہیں لکھا، کہیں سے مجھ پر وارد ہو گئی تھی اور ایسی وارداتوں کا کوئی عقلی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔[15]

"راجہ گدھ" میں رزق حلال اور حرام کے فرق کو روح اور روحانیت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

یہاں مصنفہ نے انسانی سرشت کے مسائل کو بیان کیا ہے کہ رزق حرام سے فرد کی روح میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار پیدا ہوتا ہے جس سے معاشرے میں موجود لوگ بے چینی، اضطراب اور دیوانگی جیسی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول دوہری سطح پر سفر کرتا نظر آتا ہے۔ ایک طرف عشقِ لاحاصل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی ونفسیاتی مسائل ہیں جبکہ دوسری طرف مذہب، روحانیت اور ماورائیت کے نقطۂ نظر سے ان مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔

ناول "راجہ گدھ" میں حلال اور حرام کی تفریق کے موضوع کو بیان کر کے مصنفہ نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ رزقِ حرام کی خون میں آمیزش سے روح ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے جو کہ معاشرے میں مختلف عوارض کا باعث بنتا ہے۔ افراد بے چینی، اضطراب اور دیوانگی جیسی بیماریوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ وہ کہتی تھیں۔

> میری تھیوری یہ ہے کہ جس وقت رزق حرام جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے genes تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نا امید بھی ہوتے ہیں۔ نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے، جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزق حرام سے ہماری آنے ولی نسل کو پاگل پن ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا چسکا پڑ جاتا ہے، وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔[16]

ناول میں یہ تھیوری مصنفہ نے پروفیسر سہیل جو کہ کالج میں سیمی، قیوم اور آفتاب کے استاد تھے، کی زبانی پیش کی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب "اردو ناول کے بدلتے تناظر" میں "راجہ گدھ" میں پائے جانے والے روحانی پہلوؤں سے متعلق اپنا نقطۂ نظر یوں پیش کرتے ہیں۔

ناول میں بانو قدسیہ نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقاء، اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب، مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف و روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا کیونکہ اس کا طریقہ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں بانو قدسیہ نظریاتی کمٹمنٹ کی ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن ایک بات واضح رہے کہ بانو کے یہاں کہانی کا پورا پس منظر پاکستانی معاشرہ ہے البتہ جب وہ اپنے نقطہ نظر کو روحانیت یا یوں کہہ لیجئے کہ مذہب کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں تو یہ پس منظر توسیع اختیار کر کے تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔[17]

بنیادی طور "راجہ گدھ" کی کہانی سیمی اور آفتاب کی محبت کے گرد گھومتی ہے جو ایک کالج میں کلاس فیلو ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر آفتاب اپنی بچپن کی منگیتر سے شادی کر کے لندن چلا جاتا ہے۔ آفتاب کی بے وفائی کے بعد بھی سیمی کے دل سے آفتاب کی محبت کا جذبہ کم نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک آفتاب کی محبت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس طرح ان کی محبت کی کہانی دنیاوی تقاضوں سے آگے بڑھ کر روحانی سطح پر سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محبت کے اس سفر کا اس وقت آغاز ہوتا ہے جب ایک خاص لمحے میں دونوں روحیں ایک ہی حصار میں مقید ہو گئیں۔ یہی وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب آفتاب کے دل کے رنگ اور موسم حتیٰ کہ دھڑکنیں تک سیمی کے دل میں منعکس ہونے لگیں اور سیمی کی زندگی کسی ساکت اور جامد مجسمے کی مانند رک گئی۔

> آفتاب اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے۔ آدھی آستین والی قمیض میں اس کے دونوں بازو شہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ کی مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آرہا تھا۔ شاید اسی لمحے سیمی نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہو گئی۔[18]

سیمی کی آفتاب سے محبت میں سچائی موجود ہے اس لیے کہ آفتاب کو کھونے کے بعد اس میں غیب کا علم جاننے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ سیمی اپنی ذات کے کشف سے اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں اسے غیر معمولی قوتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ آفتاب کی محبت نے اس پر اپنی ذات اور کائنات کے بہت سے راز منکشف کر دیئے ہیں۔ اس لیے وہ حال میں رہتے ہوئے بھی مستقبل کے بارے میں جاننے لگی ہے۔ اسے حالات وواقعات کے رونما ہونے سے پیشتر ہی ان کے بارے میں علم ہو جاتا ہے اور پھر وہ واقعات من و عن حقیقتاً بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے وہ قیوم کو آفتاب کی شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔

> قیوم۔۔۔ تم مانو گے تو نہیں۔۔۔ لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا۔ پہلے ہی کہ اس کی شادی کس دن ہو گی۔ میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی۔۔۔ تمہیں کیسے شک تھا۔ کیسے؟ بس مجھے معلوم تھا۔۔۔ کہ وہ چودہ تاریخ ۔۔۔اتوار کا دن۔۔۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات بارش ہو گی گرج چمک کے ساتھ۔ تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر۔[19]

عشق کی مثبت قدروں نے سیمی کو خود شناسی و خود آگاہی عطا کی۔ عشق کے استغراق نے ذات کی پہنائیوں میں اتر کر تیسری روشن آنکھ کو دریافت کیا۔ عشق نے اس کی حسیات کو بیدار کر کے اس کے مثبت خصائص کو اجاگر کیا۔ اس طرح اسے روحانی ارتقاء حاصل ہوا۔ قیوم کو اپنی اس خوبی سے متعلق بتاتے ہوئے سیمی کہتی ہے۔

تمہاری اس خوبی کا کالج میں تو پتہ نہیں تھا کسی کو۔۔۔

تب مجھ میں یہ خوبی تھی ہی نہیں۔۔۔ یہ sensitivity مجھ میں اب پیدا ہوئی ہے۔۔۔

آفتاب کو کھو کر۔۔۔
لیکن کیسے کیسے۔۔۔کیسے تمہیں ان باتوں کی اطلاع ہوتی ہے۔
محبت کرنے والے دلوں پر کئی بھید کھلتے رہتے ہیں آپی آپ قیوم۔۔۔آپی آپ۔۔۔ [20]

ایسی واردات قیوم کے ساتھ بھی پیش آتی ہیں۔ناول کے آخری حصّے میں قیوم ذہنی کرب اور ضمیر کی چبھن سے چھٹکارا پانے کے لیے سائیں جی کے ڈیرے پر جانے لگتا ہے۔سائیں جی اسے ریاضت کے ذریعے سیمی تک پہنچنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔اگرچہ وہ اس ریاضت سے سیمی تک تو نہیں پہنچ سکتا لیکن اس دوران قیوم پر کئی اسرار منکشف ہوتے ہیں اور اسے غیبی طاقتوں کا بھی ادراک ہونے لگتا ہے۔

''راجہ گدھ''کا مطالعہ کرنے کے بعد دیوانگی کے مختلف محرکات سامنے آتے ہیں۔تاہم ان سب محرکات کا تعلق جسمانی نقائص سے قطع نظر روحانی عوارض سے ہے۔

روح کی سطح پر انسان جس بے چینی،اضطراب اور ناآسودگی جیسی کیفیات کا شکار ہوتا ہے وہ اپنی انتہائی سطح پر پہنچ کر انسان کو دیوانگی سے دوچار کرتی ہیں۔دیوانگی کا ایک محرک عشق لاحاصل ہے۔

> مانے نہ مانے کوئی۔۔۔اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔صرف ایک وجہ،عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔ [21]

ناول کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے انھیں مخصوص ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔پہلے حصے کا نام ''عشقِ لاحاصل ہے''۔ کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی قابیل نے جنون میں آکر اپنے بھائی ہابیل کا جب قتل کیا تو اس عشق لاحاصل سے دیوانگی نے جنم لیا۔ بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں اس واقعے کا حوالہ دے کر یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دیوانگی کا وجود اسی واقعے کے بعد دنیا میں متعارف ہوا یہ اس کائنات کا پہلا موقعہ تھا جب ایک انسانی وجود کا ایک انسان کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ گویا انسانیت کا انسانیت کے ہاتھوں یہ پہلا قتل ہی دیوانگی کا محرک بنا۔ قابیل کے لیے اپنی لاحاصلی کو برداشت کرنا جب مشکل ہو گیا تو وہ اس ذہنی اذیت کا شکار ہوا جس نے اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہیں سے دیوانے پن کا خمیر انسانی لہو میں شامل ہوا۔اس واقعے کا ذکر کر کے بانو قدسیہ نے اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ ''راجہ گدھ''میں سیمی کا کردار بھی اسی لاحاصلی کے کرب سے دوچار ہوا ہے جس سے قابیل ہوا تھا لیکن بانو قدسیہ نے سیمی کے مقابل قیوم کا کردار پیش کر دیا ہے جس کے وجود پر وہ لاحاصلی کا سارا ملبہ ڈال کر چند لمحوں کے لیے پُر سکون ہو جاتی ہے۔

''راجہ گدھ''کے ایک اور حصے کا نام مصنفہ نے ''لامتناہی تجسس'' رکھا ہے جو کہ دیوانگی کا ایک محرک ہے۔انسانی فطرت ہے کہ وہ ہمہ وقت سوال کرتا ہے کیوں؟کیسے؟کب؟اور جب اسے ان سوالوں کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ اضطراب کا شکار ہوتا ہے اور پھر یہی اضطراب اسے دیوانگی سے ہمکنار کرتا ہے۔''راجہ گدھ'' میں قیوم کا کردار ہی راجہ گدھ ہے اس لیے اسے ہمیشہ مردار سے ہی واسطہ رہا ہے۔اسے اس سوال کہ میری تقدیر میں مردار ہی کیوں؟نے دیوانہ کیا ہے۔

میرے اندر سیمی کے مرنے سے کئی سوال اُبھر آئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔۔۔ سیمی کے مرنے کی کیا وجہ تھی۔۔۔اگر کوئی خدا تھا تو اس نے اس جیسی لڑکی کو مرنے کیوں دیا؟۔۔۔اگر روح موجود تھی تو پھر وہ اب مجھ سے کیوں مل نہیں سکتی تھی۔[23]

رزق حرام کے حوالے سے مصنفہ کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اس میں ایسے منفی چار جز ہوتے ہیں جو انسانی سوچ اور فکر پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں جس سے انسان ذہنی پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے وہ مذہبی حوالے سے بھی اس نقطے کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہمارے مذہب میں مردار کو اسی لیے حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ اخلاقی اور روحانی تغیرات کا باعث بنتا ہے اور پھر یہی تغیرات دیوانگی کا محرک ٹھہرتے ہیں۔نیلم فرزانہ اس حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

اس ناول میں رزقِ حرام و حلال کا مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ موجودہ دور میں حرام کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور پورا معاشرہ جس طرح اس کی لپیٹ میں ہے،اس نے انسان کو دیوانہ بنا دیا ہے۔وہ مذہبی اور اخلاقی ہر قید سے آزاد ہو کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جو صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کر سکے۔۔۔لیکن مصنفہ کی نظر میں دیوانگی کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ان کا نقطۂ نظر ہے کہ انسان جب ترقی کرتا ہے تو دیوانگی کی طرف بڑھتا ہے۔اس کی یہ دیوانگی منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی۔سائنس کی عظیم ایجادات انسانیت کے لیے قاتل بھی ہو سکتی ہیں اور انسان کی فلاح بھی کر سکتی ہیں تو پھر کیوں نہ انسان اپنی ذہنی اختراعات اور اپنی طاقت کو انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔زندگی کے تئیں یہی مصنفہ کا نقطۂ نظر ہے جو ناول میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔[23]

ناول ''راجہ گدھ'' کے تمام کردار رزق حرام کھانے سے دیوانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اور طرح طرح کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایک جگہ وہ لکھتی ہیں۔

جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔اس کے لہو کی ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔[24]

''راجہ گدھ'' میں بانو قدسیہ نے دیوانگی کی ایک اور قسم بھی بیان کی ہے۔یہ وہ دیوانگی ہے جو رزق حلال اور حرام کے علاوہ ایک تیسری قسم کے رزق سے پیدا ہوتی ہے۔جو روح کو توانائی عطا کرتا ہے اور انسان کو آگہی و عرفان کی دولت سے نوازتا ہے۔اس رزق سے genes صدیوں کا ارتقاء لمحوں میں طے کرتے ہیں اور انسان دیوانے پن کی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی راز،راز نہیں رہتا اور حیات و کائنات کی مخفی قوتیں اس پر ظاہر ہونے لگتی ہیں۔یہ دیوانگی کی وہ قسم ہے جو خدا اپنے مخصوص بندوں کو عطا کرتا ہے۔

ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے ۔۔۔پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔۔۔دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے۔عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں۔[25]

ناول میں آفتاب کا بیٹا افراہیم دیوانگی کی اس سطح پر ہے جہاں اسے کشفی صلاحیتیں حاصل ہو گئی ہیں اور وہ ان دیکھی سرزمینوں اور لوگوں کے بارے میں باتیں کرنے لگتا ہے۔اس کا ذہن ایک اور سمت دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آفتاب قیوم کو افراہیم کی دیوانگی کے بارے میں بتاتا ہے:

> افراہیم کہتا ہے کہ اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔۔۔وہ اپنے آپ کو۔۔۔دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔۔۔کبھی کبھی وہ فر فر عربی بولنے لگتا ہے۔۔۔کبھی۔۔۔عبرانی میں باتیں کرتا ہے۔۔۔میں۔۔۔اس کے خوابوں سے تنگ آگیا ہوں قیوم۔۔۔وہ کہتا ہے کوئی فرشتہ اسے پھل کھلانے آتا ہے۔[26]

الغرض پورے ناول میں روح اور روحانیت کے حوالے سے بانو قدسیہ نے صوفیانہ خیالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اور اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ انسان اسلامی اقدار اور روایات سے منہ موڑ کر اپنے لیے خود تباہی کا بندوبست کرتا ہے۔ان کی دیگر تخلیقات میں بھی حیات و کائنات کے مسائل، روح اور روحانیت، انسان کی حقیقت اور اس سے متعلقہ افکار کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔انہی افکار و خیالات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ بانو قدسیہ کو نہ صرف تصوف کے موضوع سے خصوصی لگاؤ ہے بلکہ تصوف کے اسرار و رموز کو اپنی تخلیقات میں بخوبی برتا بھی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

[1]۔ ممتاز مفتی، **بانو قدسیہ: پتی بھگت**، (مشمولہ) اور اوکھے لوگ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۲۔

[2]۔ بانو قدسیہ، **(انٹرویو)** از راقمہ، لاہور، ۱۹ ستمبر ۲۰۱۳ء، بوقت ساڑھے تین بجے سہ پہر۔

[3]۔ فتح محمد ملک، **ایک دلیر خاتون**، (مشمولہ) راوی (مجلہ)، گورنمنٹ کالج لاہور، جلد ۹۸، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۰۔

[4]۔ عبدالوحید، **بانو قدسیہ۔۔۔روحانیت کا پرچارک**، (مشمولہ) راوی (مجلہ)، گورنمنٹ کالج لاہور، جلد ۹۸، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۸۔

[5]۔ سدید، ڈاکٹر انور، **بانو قدسیہ: شخصیت اور فن**، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۲۳۔

[6]۔ صابر لودھی، **بانو آپا**، (مشمولہ) راوی (مجلہ)، گورنمنٹ کالج لاہور، جلد ۹۸، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۱۔

[7]۔ سہیل وڑائچ **(انٹرویو)**، **ایک دن جیو کے ساتھ**، (بحوالہ انٹرنیٹ)، ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء، لنک نادر۔

[8]۔ بانو قدسیہ، **دست بستہ (دیباچہ)**، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۸۔

[9]۔ عبدالوحید، **بانو قدسیہ۔۔۔روحانیت کا پرچارک**، (مشمولہ) راوی (مجلہ)، گورنمنٹ کالج لاہور، جلد ۹۸، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۷۔

[10]۔ بانو قدسیہ، **راہِ رواں**، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۶۔

[11]۔ ایضاً ص ۳۳۴۔ [12]۔ ایضاً ص ۳۷۹۔

[13]۔ سہیل وڑائچ، **بانو قدسیہ (ادیبہ اور ناول نگار)**، ۱۷ اگست ۲۰۱۳ء، بحوالہ انٹرنیٹ۔
(www.ilmkidunya.com/picture_gallery/an-interview-with-bano-qudsia9227.aspx)

[14]۔ بانو قدسیہ، **راہِ رواں**، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۷۳۴۔

[15]۔ ایضاً ص ۷۳۴۔

[16]۔ بانو قدسیہ، **راجہ گدھ**، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷۶۔

[17]۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، **اُردو ناول کے بدلتے تناظر**، ویلکم بک لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۴۔

[18]۔ بانو قدسیہ، **راجہ گدھ**، ص ۱۳۔

[19]۔ ایضاً ص ۵۷۔ [20]۔ ایضاً ص ۱۰۳۔

[21]۔ ایضاً ص ۱۴۔ [22]۔ ایضاً ص ۲۰۱۔

[23]۔ نیلم فرزانہ، **اُردو ادب کی خواتین ناول نگار**، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۔

[24]۔ ایضاً ص ۹۵۔

[25]۔ ایضاً ص ۳۸۳۔

[26]۔ ایضاً ص ۴۴۹۔